ڈاکٹر انور علی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ اسلامیہ کالج پشاور
اختر علی، اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج کبل سوات
ڈاکٹر طاہر عباس طیب ،اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،جی سی ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ
Dr. Anwar Ali, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Islamia College Pashawar.
Akhtar Ali, Assistant Professor, Govt Degree College, Kabal Sawat.
Dr. Tahir Abbas Tayib, Assistant Professor, Department of Urdu, GC Women University, Sialkot.

مِٹرو پولائزیشن کے تناظر میں کشور ناہیدؔ کی غزل کا تحقیقی مطالعہ

RESEARCH STUDY OF KISHWAR NAHEED'S GHAZAL IN THE CONTEXT OF METROPOLISATION

Abstract:
Metropolisation is one of the prominent elements of Post Modernism. After world war_2, Eastern nations and specially America started propaganda of Globalization. Due to Globalization, a sense of consumerism and commoditization was developed in the third world countries. This situation leaded towards Metropolisation, as a result big cities became over crowded due to mega migrations of population. Issues of self-recognition and resumption of the past affected individuals, which caused social distancing and singleness. Kishwar Naheed, in her Ghazals coverd all the aspects and issues arised due to Metropolisation. In this article a research study is placed about Kishwar's Metropolised views.

Key Words: *Metropolisationm Elements, Modernism, America, Globalization.*

مابعد جدید صورتحال زندگی اور اس سے متعلقہ امور میں کئی انقلابات کا سبب بن گئی۔ایک طرف کلیت و حتمیت کے چراغ بجھنے لگے تو دوسری جانب کثرت و تعدد کے گن گائے جانے لگے۔ بعض حضرات مابعد جدیدیت کے مطلق انکاری ہیں اور اسے اپنی طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے نہیں تھکتے جبکہ بعض اور ایسے ہیں جو اسے چائے کی پیالی میں اٹھنے والا طوفان کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ بات یہ نہیں کہ کون سا نظریہ ہماری انا کی تسکین کرتا ہے اور کون سا نہیں۔ بات یہ ہے کہ ادبی بساط پر درپیش منظر نامے کی حقیقیت کیا ہے اور اس کا وجود ادب کی ذات پر کیا

اثرات مرتب کرتا ہے۔یوں ذاتی پسند وناپسند کو بالائے طاق رکھ کر نظریات کی چھان پھٹک کرنا ادبی محققین کا فرض بنتا ہے۔ پھر چاہے کوئی نظریہ صدیوں تک زندہ رہے یا اگلے ہی لمحے اس کی موت واقع ہو جائے۔

نو آبادیاتی زمانے میں طاقتور اقوام نے کمزور اقوام کو اپنی نو آبادیات بنا کر ان کی قومی و تہذیبی شناخت کو مٹاڈالا۔ان کا دعویٰ تھا کہ خدا نے انھیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ جاہل اقوام کی اصلاح وتربیت کریں۔اس طرح نو آبادیاتی رعایا کو یہ باور کرایا گیا کہ ان کے عقائد،روایات اور تہذیب وثقافت فرسودہ ہیں۔ان پر کاربند رہ کر وہ ترقی نہیں کر پائیں گے بلکہ زوال در زوال کا شکار رہیں گے۔اس کے متبادل کے طور پر ان کے آگے درآمد شدہ تہذیب و ثقافت کا ماڈل رکھ دیا گیا اور انھیں قائل کیا گیا کہ یہی بیرونی ماڈل ان کی خواہشات کی تکمیل میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔یہی کچھ برطانیہ کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے ساتھ بھی ہوا۔برطانوی تہذیبی ماڈل کے اثر و نفوذ نے ہندوستانی تہذیب کو پسپا کر کے اس کی جگہ لے لی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد مابعد جدید صورتحال کا جنم ہوا جس نے مغربی فکر کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا کہ مغربی تہذیب واحد،کلی اور حتمی تہذیب ہے۔مابعد جدیدیت نے ہر طرح کی سامراجی سوچ پر رد کیا۔اس نے مرکزیت کو توڑ ڈالا اور حاشیے پر رکھے گئے لوگوں کو مرکز میں لانے میں کردار ادا کیا۔یوں جنگِ عظیم دوم کے بعد تمام نو آبادیاتی اقوام کو آزادی مل گئی اور دنیا کا نقشہ بدلنے لگا۔

مِٹروپولائزیشن Metropolisation مابعد جدید اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم وسائل وسہولیات سے استفادہ کرنے کی خاطر دیہات سے شہروں کی جانب انتقالِ آبادی اور اس کے نتیجہ میں جنم لینے والے مسائل کا سامنا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں استعماری طاقت کی موجودگی و حضوری کے بغیر کسی قوم کو نو آبادیاتی شکل وصورت دینا ممکن نہیں تھا،اس لیے استعماری قوتیں مختلف بھیس اختیار کر کے غیروں کی سرزمین میں داخل ہو کر اپنا تسلط جماتیں۔اس مقصد کے لیے انھیں کافی عرصہ مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل کر گزارنا پڑتا،تاکہ ان کی زبانوں، عقائد،رسوم اور تہذیب وثقافت سے کماحقہ واقفیت حاصل کی جائے کیوں کہ مقامی ماحول سے واقف ہوئے بغیر اپنی اجارہ داری قائم کرنا آسان نہیں تھا۔یوں نو آبادیاتی عہد میں نو آبادکار کی موجودگی لازمی تھی۔مگر مابعد جدیدیت کے فروغ نے استعماری اجارہ داری کا خاتمہ کر کے نو آبادیاتی ممالک کو استعمار کے تسلط سے واگزار کرالیا۔بظاہر تو نو آبادیات کا خاتمہ استعمار زدہ اقوام کے لیے خوشی کا اقدام تھا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔مابعد جدیدیت کے زیر اثر دنیا نو آبادیاتی عہد سے نکل کر مابعد نو آبادیاتی عہد میں داخل ہوگئی۔مابعد نو آبادیاتی عہد میں عالم گیریت

Globalization کا نعرہ بلند کیا جانے لگا جس کا مقصد دنیا کو عالمی گاؤں میں متشکل کرنا تھا۔اس مقصد کے لیے میڈیا اور انٹرنیٹ کے نظام کو وسعت دے کر خوب استعمال میں لایا گیا۔ صارفیت کلچر کو فروغ دے کر دنیا کو عالمی منڈی میں تبدیل کیا گیا جس کے نتیجے میں اجناس پرستی کا رجحان بڑھ گیا اور ہر شے برائے فروخت بن گئی۔مابعد جدیدیت کا فروغ امریکہ کا منصوبہ تھا۔اس کے مقاصد و اہداف کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

> "اشیا، ٹیکنالوجی، لوگوں، خیالات، خبروں، کتابوں کی ہر سمت اور محیر العقول تیز رفتاری کے ساتھ نقل و حرکت، عالم گیریت ہے۔ لیکن یہ ساری نقل و حرکت مساویانہ نہیں۔ لہٰذا دنیا کا ایک حصہ پیش کار (پروڈیوسر) ہے اور دوسرا حصہ صارف (کنزیومر) ہے؛ ایک حصہ خالق و حاکم ہے اور دوسرا محکوم و خریدار۔ دنیا بھر کی اشیا، زبانوں، ثقافتوں کی آزادانہ نقل و حرکت نہیں، بلکہ مغربی دنیا (بالخصوص امریکا، ہالی ووڈ، میکڈونلڈ، امریکی پالیسی) کی اشیا کی یک طرفہ نقل ہے باقی دنیا کی طرف۔ دنیا کو عالمی گاؤں کہا جاتا ہے، بلکہ اب تو عالمی ڈرائنگ روم کہا جانے لگا ہے، مگر اس میں جو کچھ ہے، مغربی، امریکی ہے۔"(۱)

عالم گیریت کے تحت امریکہ نے تیسری دنیا کے ممالک کو دیگر استعماری طاقتوں کے پنجوں سے آزاد کرا کر اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔بظاہر تیسری دنیا کے ممالک نے نو آبادیات سے مابعد نو آبادیات کی جانب سفر کیا مگر در حقیقت یہ سفر احضاری نو آبادیات سے سائبر نو آبادیات کی جانب تھا۔ نو آبادیاتی نظام میں استعمار کار کی موجودگی ضروری تھی مگر مابعد نو آبادیاتی یا نئی نو آبادیاتی نظام میں میڈیا اور انٹرنیٹ کے نظام کے ذریعے پوری دنیا پر اجارہ داری قائم کی گئی ہے۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

> "مابعد جدیدیت کی تحریک کو منظر عام پر لانے میں یورپ کی معاشی خوشحالی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں مشرقی یورپ میں کمیونزم کی ناکامی اور پسپائی نے مابعد جدیدیت کو مزید تقویت فراہم کی۔ اس دوران ثقافتی شناخت، لسانیت اور سماجی مکالمے کے ساتھ ساتھ صارفیت اور لائف اسٹائل پر زور دیا جانے لگا اور آفاقی فلاح، نجات، صداقت اور خیر کے تصورات نظر انداز کر دیے گئے۔"(۲)

عالم گیریت اور صارفیت کے تحت بڑے شہروں میں سہولیات کی بھرمار ہونے لگی تو دیہی علاقوں کے لوگ ان سہولیات سے مستفید ہونے کی غرض سے کثیر تعداد میں شہروں کی جانب منتقل ہونے لگے۔ بادی النظر میں دیہات سے شہروں کی جانب انتقالِ آبادی کوئی اہم مسئلہ دکھائی نہیں دیتا مگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس معمولی ہجرت کے نتیجے میں کافی سارے مسائل جنم لینے لگتے ہیں جن میں اکثر مسائل نفسیاتی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔

شہری زندگی کاروباری زندگی ہوتی ہے۔ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ لوگوں کے لیے قیمتی ہوتا ہے۔ مسلسل کمانا اور بچت کرنا شہری لوگوں کا ترجیحی مقصد ہوتا ہے۔ کچھ کمانے اور مستقبل کو سنوارنے کی خاطر افراد کے مابین ایک دوڑ لگی رہتی ہے۔ اس دوڑ میں مادیت مد نظر رہتی ہے اس لیے احساسات کچل دیے جاتے ہیں۔ دیہی علاقوں سے ہجرت کرنے والے شہری زندگی کی ان ناہمواریوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ شہر جاکر دوسروں کی طرح وہ بھی سہولیات بھری زندگی کے مزے لوٹیں گے۔ مگر یہاں آکر ان کی شخصیت بکھر جاتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ شہروں میں انسانیت کی کوئی توقیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف وہ شہری زندگی کے ساتھ قدم ملا کر جینا چاہتے ہیں مگر دوسری جانب دیہی روایات کو یاد کر کر کے ماضی کی بازیافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت دوہری ہو کر یاس، تنہائی اور بے سہارگی کا شکار ہو کر اپنی جڑوں کی تلاش پر مائل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت ہے جس سے متاثر ہو کر فرد کے سامنے اس کی شناخت کا مسئلہ سر اٹھانے لگتا ہے جو اسے بے چین کیے رکھتا ہے۔ ناصر عباس نیر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "چونکہ بڑے شہروں میں مقامی اور عالمی مہاجرین کثرت میں ہوتے ہیں، اس لیے ہر شہر بالائی سطح پر بین الاقوامیت کا شائبہ ابھارتا ہے، مگر زیریں سطحوں پر ہر بڑے شہر میں چھوٹے چھوٹے نسلی، وطنی، لسانی اور قومیتی گروہ وجود رکھتے اور سرگرم ہوتے ہیں، جس سے ان بڑے شہروں میں جڑوں کی تلاش ایک اہم رجحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شہر کی کاروبار ذہنیت اگر شہر کو Dehumanize کرتی ہے تو جڑوں کی تلاش اسے انسانی سطح سے مربوط کیے رکھتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت میں یہ دونوں متضاد عناصر Dehumanization اور ماضی کی بازیافت موجود ہیں۔"(۳)

شہری زندگی کی سرد مہری، جڑوں کی تلاش اور ماضی کی بازیافت کا مسئلہ اکثر ادبا و شعرا کے پیش نظر رہا اور انھوں نے اپنی تخلیقات میں ان مسائل کی جانب اشارے کیے۔ اردو شاعرات میں سے کشور ناہیدؔ نے شہروں کی

جانب انتقالِ آبادی Metropolisation اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والی صورت حال کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی غزلوں میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے۔ کشورؔ بلند و بالا عمارات میں انسان کی گم شدگی، تنہائی، بے زبانی اور ہجوم کی نوحہ گر بن کر شہری زندگی کے حقائق کی پردری کرتی ہیں۔ شہروں میں کاروبار عروج پر ہوتے ہیں۔ کثرتِ آبادی کے سبب زمین سکڑ جاتی ہے۔ جس قدر زمین سکڑتی جاتی ہے، قیمتیں بڑھنے لگتی ہیں؛ اس لیے افراد کے درمیان زیادہ کمانے اور بلند عمارات تعمیر کرنے کی دوڑ لگ جاتی ہے۔ چھت پر چھت تعمیر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ عمارات کی بلندی کے باعث لوگوں کو اپنے حصے کا آسمان دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ یوں مادی خواہشات کی تکمیل کی خاطر فرد اپنے ہم نفسوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مہر و محبت انسانی باطن کی غذا ہے۔ اس کی قلت فرد کو اندر سے کمزور کر دیتی ہے۔ مگر فرد فطری جذبات کو تصنع سے آلودہ کر کے گھاٹے کا سودا کر لیتا ہے۔ اس لیے انسان ظاہر میں باوقار زندگی گزارتا نظر آتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کشورؔ کہتی ہیں:

اونچی چھتوں کے شوق نے توڑا فسونِ شوق
خاکستری زمیں کی طرح آسماں لگا[۴]

آگے بڑھنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی یہ روش افراد کے سکون کو برباد کر دیتی ہے۔ افراد نفسیاتی طور پر خود اذیتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ظاہر کی بجائے باطن کی طرف کھل جاتی ہیں۔ اردگرد کے ماحول سے بیگانگی جنم لینے لگتی ہے اور فرد اپنے باطن میں پناہ ڈھونڈنے کی سعی کرتا ہے جس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ فرد تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھیڑ میں تنہائی کا شکار ہونا ایک ایسا تلخ تجربہ ہے جس کا سوائے اس کے کوئی علاج نہیں کہ فرد زندگی کے اس ڈگر کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ منتخب کر لے مگر ایسا کرنا بھی اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ تنہائی کے اس شدید احساس سے چھٹکارا پانے کا فرد کے پاس کوئی حل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ اپنے آپ سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ خود کو اذیت دے دے کر دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں ہر لمحہ سلگتی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اسے باہر کے ماحول میں سکون ملتا ہے اور نہ ہی گھر کے اندر۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ فرد روشنیوں سے تاریکیوں کے تنگ غار کی طرف محوِ سفر ہوتا ہے۔ یہ تاریکیاں اس کی شخصیت کو توڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ شہری زندگی کی تنہائی کی اس کیفیت کا اظہار کشورؔ نے خوبصورت پیرائے میں کچھ اس انداز سے کیا ہے:

زرد رُو تنہائیوں کے شہر میں
بجھتے دیپوں کی طرح جلنا بہت
گھر کے اندر کاٹتی ہے تیرگی
گھر سے باہر رہ کے بھی ڈرنا بہت (۵)

تنہائی کا یہ احساس یہاں پہنچ کر رک نہیں جاتا بلکہ مزید گہرا ہوتا جاتا ہے۔ شہری زندگی میں صنعتوں کا راج ہوتا ہے جو فطری ماحول کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ آبادیوں کی توسیع کی خاطر درخت کٹ جاتے ہیں۔ میدان و سبزہ زار مارکیٹوں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں بدل جاتے ہیں۔ آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ شہر کی فضا پر دھوئیں کا راج ہونے لگتا ہے۔ حدت و تپش کی شدت کی بدولت بادلوں کا گزر نہیں ہوتا۔ بارشوں کی قلت ماحول کو دھندلا دیتی ہے۔ ایک طرف تنہائی اور دوسری طرف یہ پھیکا پھیکا سماں فرد کو معاشرتی، جسمانی اور ذہنی لحاظ سے مفلوج کر دیتا ہے۔ فضا کا یہ پھیکا پن اور تنہائی مل کر فرد کے گلے میں لٹکتے ہوئے سانپ بن کر اسے ڈسنے لگتے ہیں۔ اس منظر کی صورت گری کشورؔ نے ان الفاظ میں کی ہے:

پھنکارتا ہے شہر میں تنہائیوں کا سانپ
لہرا سکے نہ چاہ کے بادل یہاں کبھی (۶)

تنہائی بے زبانی کی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔ تنہائی کی بدولت جب فرد شدتِ یاس کا شکار ہو جاتا ہے تو اسے خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کی لت پڑ جاتی ہے۔ اپنے زخموں کو ہر وقت، ہر لمحہ تازہ رکھنا اس کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ بجھا بجھا سا رہتا ہے اور اپنے ہم نفسوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ ہم نفسوں سے منہ موڑنا تو ایک طرف وہ اپنی ذات سے بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت میں اسے سننا گوارا ہوتا ہے اور نہ ہی بولنا۔ اس کی زبان پر تالا پڑ جاتا ہے۔ جس طرح وہ سننا اور بولنا گوارا نہیں کرتا اسی طرح ہم نفسوں کے چہرے دیکھنے اور اپنا چہرہ دکھانے سے بھی اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آئینہ دیکھنے سے بھی احتراز کرتا ہے کیوں کہ آئینہ میں اپنی بے زبانی دیکھ کر اسے ہم نفسوں کی بے زبانی اور ان کی سرد مہری ڈسنے لگتی ہے۔ اس کیفیت کی جانب کشورؔ اپنے مخصوص لب و لہجے میں یوں اشارہ کرتی ہیں:

خواہش سکوں کی شوقِ جراحت مسل گئی
ہر شخص آئینے کی طرح بے زباں لگا (۷)

تنہائی کا یہ احساس جب مزید شدت اختیار کر لیتا ہے تو شہری فرد کی نظر میں شہر اور جنگل کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ویرانی اور آبادی اسے یکساں نظر آنے لگتے ہیں۔ تنہائی سلاسلِ جبر و ستم بن کر اس کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد ایک ماحول کا احساس کرتا ہے مگر اس کی نوعیت سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ جس قدر وہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہے اسی قدر اسے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہری لوگ ذات کے احساس سے اس قدر عاری ہو چکے ہیں کہ اگر ان کے گلوں پر چھری بھی پھیر دی جائے تو اُف تک نہیں کریں گے۔ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے جاتے ہیں لیکن بے حسی کی انتہا دیکھیے کہ وہ لب تک نہیں کھولتے۔ انھیں روزی کی تلاش میں اس قدر مصروف رکھ لیا گیا ہے کہ ان میں جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت نہ رہی۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے شہر زندہ انسانوں سے خالی ہو چکے ہوں۔ کشورؔ اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتی ہیں:

لگتا ہے اب تو شہر میں رہتا نہیں کوئی
زندانیٔ ستم ہیں یہ کہتا نہیں کوئی (۸)

شہری زندگی کے بھیڑ کا پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ شہروں میں جس قدر بھیڑ ہوتی ہے اسی قدر انسان اکیلا ہوتا ہے۔ ہجومِ عکس ہوتا ہے مگر جذبات، احساسات اور مروت سے خالی۔ فرد کے ارد گرد لاکھوں انسانی چہرے چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نظر آتے ہیں مگر ان تمام چہروں پر کاغذی چہروں کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں انسان کو غرض اور مقصد کے پیمانوں پر ناپا جاتا ہے۔ ہر بات مطلب کی بات ہوتی ہے۔ مطلب کے سوا کوئی بات نہیں ہوتی۔ مقصد کی تکمیل کی خاطر دھوکہ و فریب کو عقل مندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایسا طبقہ جو سوچنا چاہتا ہے۔ انسانوں کی جستجو کرنا چاہتا ہے۔ محبت و مروت کو عام کرنا چاہتا ہے اور زندگی کو ایک خاص مقصد کے تابع لانا چاہتا ہے۔ ایسے طبقہ کو شہری زندگی میں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ ان کے جذبات و احساسات کا خون ہوتا رہتا ہے۔ ان پر یہ راز آشکار ہو جاتا ہے کہ شہروں میں رہنے والے افراد کی جڑیں زمین میں پیوست نہیں ہوتیں بلکہ ان کی مثال خلا میں تیرنے والی اشیا کی ہوتی ہے جن کی پیوستگی ایک سوالیہ نشان بنی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر میں بعض خاص گروہ جڑوں کی تلاش کی جانب مائل ہوتے ہیں اور ماضی کی بازیافت کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان طبقات کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ آیا وہ ماضی کی بازیافت کرنے میں کامیاب ہو کر شہری زندگی کے نظام کو بدلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا پھر ناکام ہو کر اسی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ان کی یہ سعی تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ وہ شہری زندگی کے نظام کو تبدیل کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ وہ دوسرے افراد لے لیتے ہیں جو ان کی طرح

سہولیات کے حصول کی خاطر شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے اور ساتھ ساتھ شہروں کی توسیع ہوتی رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرتی آفات کے سبب شہر اجڑ جاتے ہیں۔ اجڑنے کے ساتھ شہر کا نظام بھی مٹ جاتا ہے۔ انھیں از سرِ نو بسایا جاتا ہے اور دوبارہ ایک ایسا عہد آجاتا ہے جس میں جڑوں کی تلاش کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے۔ بعض صورتوں میں شہر جزوی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس صورت میں افراد اپنے قدیم ٹھکانوں کی جانب منتقل ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ شہروں کا رُخ کرتے ہیں اور جب شہری نظام اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے تو افراد ماضی کی بازیافت کرنے لگتے ہیں کیوں کہ انھیں پھر وہی مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ چہرے تو بہت سارے ہوتے ہیں مگر ان میں جان نہیں ہوتی۔ کشورؔ اس منظر کو الفاظ کے قالب میں یوں پیش کرتی ہیں:

ہجومِ عکس میں چہرہ تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل اساسِ خلا نکلتی ہے(۹)

شہری زندگی کی بھیڑ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فرد اپنے دیرینہ رشتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ خود غرضی کے مارے افراد کے دلوں میں مروت کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ اور تو اور خونی رشتے بھی جان پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ بزرگوں کی شفقت کا سایا زحمت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض بدنصیب بوڑھے ماں باپ تک کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اسی طرح اولاد بھی بعض صورتوں میں بوجھ بن جاتی ہے۔ ایسے کئی حادثات وقوع پذیر ہو چکے ہیں کہ معاشرہ کی بے حسی سے تنگ آکر والدین نے پہلے اپنی اولاد کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا اور پھر خودکشی کی۔

بھیڑ کا ایک پہلو نسیان کا مرض بھی ہے۔ شہری زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ فرد خود کو بھی وقت نہیں دے پاتا۔ بیک وقت فرد کے ذہن میں لاتعداد افکار کا ایک ہجوم برپا ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات کروٹیں لیتے رہتے ہیں۔ وہ کام میں مصروف ہوتا ہے مگر کئی اور کام جو اسے انجام دینے ہوتے ہیں، ان کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ خیالات کے اس ہجوم کی بدولت اس کا حافظہ کمزور ہونے لگتا ہے۔ اہم امور تو اسے یاد رہتے ہیں مگر جن کی اہمیت اس کی نظر میں کم ہوتی ہے، انھیں بھلا دینا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کار بازار میں بھول جاتا ہے۔ دفتر کے فائل گھر میں چھوڑ دیتا ہے اور دفتر پہنچ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے جو جوتے پہنے ہیں اس کا ایک پیر دوسرے سے مختلف ہے۔ بلکہ کشورؔ کی نظر میں تو بعض اوقات بھیڑ کی وجہ سے چلنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ اگر خدانخواستہ بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑنا بھول گیا تو کہیں کھو جائے گا۔ یہاں

ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے کہ بھولنا محض بڑوں کا مسئلہ نہیں بلکہ بچے بھی شہری زندگی کی زد میں آکر باطنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے کشورؔ کا شعر دیکھیے:

وہ بھیڑ ہے کہ شہر میں چلنا محال ہے
انگلی پکڑ نا باپ کی بچہ نہ بھول جائے(۱۰)

جیتے جی لوگوں کے دلوں میں کسی انسان کی قدر نہیں ہوتی مگر جب اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ ایک عام سی بات ہے مگر شہری زندگی میں اس بے توجہی کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے۔ عام حالات میں تو پھر بھی موت کے بعد احساس ہونے لگتا ہے مگر شہروں میں بچھڑنے کے بعد بھی کمی کا یہ احساس شاذ ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بے توجہی اور کھنچے رہنے کی خصلت شہری زندگی کی رِیت ہے۔ شہری فرد انسانی صورت، انسانی جذبات، اور انسانی ہمدردی و توجہ کے لیے ترس جاتا ہے۔ اس کا یہ ترسنا، ترسنا کی حدوں کو چھو لیتا ہے جو ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے۔ جب انسان بے توجہی کا شکار ہو جاتا ہے اور بنیادی ضروریات و سہولیات سے محروم رہتا ہے تو یہ محرومی ترسنا کی پر منتج ہو جاتی ہے۔ فرد قنوطیت کا شکار ہو کر بہتر زندگی کی سعی ترک کر لیتا ہے اور خلوت نشین ہو کر گم نام زندگی گزارنے لگتا ہے۔ کشورؔ بذات خود اس بے توجہی کا شکار رہیں۔ گھریلو زندگی میں بھی انھیں وہ توجہ نہ ملی جس کی وہ طلب گار تھیں اور باہر کے ماحول سے بھی انھیں شکوہ رہا۔ شرکائے کار، اقربا اور افسرانِ بالا کی بے توجہی کا انھیں زندگی بھر قلق رہا ہے۔ اس حوالے سے کشور کہتی ہیں:

جب شہر سے چلے تو زمانے کو غم ہوا
تھے شہر میں تو منہ نہ لگاتا تھا کوئی بھی(۱۱)

تنہائی اور بے توجہی کی وجہ سے اضطراب و بے چینی جنم لیتی ہے۔ بے چینی کی یہ کیفیت جب انتہا کو پہنچتی ہے تو انسان کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ نفسیاتی دباؤ اور اعصابی تناؤ بڑھنے لگتا ہے۔ جسم بے جان سا ہونے لگتا ہے۔ چہروں پر مردنی سی چھائی رہتی ہے۔ یوں فرد سستی اور کاہل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا۔ کام سے جان چھڑانے کے لیے مختصر وسیلے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ سہاروں کی ضرورت بڑھنے لگتی ہے۔ اس سستی کی انتہا یہ ہے کہ شہری لوگ اپنے گھروں سے صحنوں کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ شائد اس لیے کہ مرکزی دروازہ سے آرام گاہ تک پہنچنے میں وقت بھی لگے گا اور یہ فاصلہ طے کرنا مشکل بھی ہو گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صحنوں کی صفائی ستھرائی کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے لوگ بند اور حبس زدہ گھروں میں رہنے کو ترجیح دینے لگتے ہیں جن میں اپنے حصے کا

آسمان دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔یوں معاشرہ کی ذہنی وجسمانی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ منظر کشورؔ کے الفاظ میں دیکھیے:

گھروں سے صحن اڑتے جارہے ہیں
بہت اب لوگ کاہل ہوگئے ہیں(۱۲)

اس طرح شہری فرد کے مسائل روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں۔معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ خانگی مسائل بھی بڑھتے رہتے ہیں مگر فرد کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ کم از کم وہ اپنے گھریلو مسائل پر ہی توجہ دے۔ کشورؔ فرد کے اس طرز عمل کی شاکی ہیں۔اس لیے طنز کا پیرایہ اختیار کر کے کہتی ہیں:

کبھی تو جھانکیے اپنے گھروں میں
بہت اپنے مسائل ہوگئے ہیں(۱۳)

شہری زندگی کی رفتار کی بدولت عدم اعتماد کو اعتبار حاصل ہوتا ہے۔اس لیے باہمی تعلقات محدود ہوتے ہیں۔عدم اعتماد کی بدولت نہ کسی کا سہارا لیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی کو سہارا دیا جاتا ہے۔لاتعلقی کی بدولت عدم برداشت کو فروغ حاصل ہوتا ہے،اس لیے انسان،انسان سے خوف زدہ رہتا ہے اور معاشرتی امن خطرہ کا شکار رہتا ہے۔اس لیے کشورؔ کہتی ہیں:

اس شہر میں دریا کو بھی رستہ نہیں ملتا
وہ قحطِ تعلق ہے کہ سایہ نہیں ملتا(۱۴)

جب معاشرہ کی حالت اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس سے کسی خوش خبری کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ہر طرف غیر یقینی کی کیفیت نظر آتی ہے۔زندگی کے تمام شعبے بے ترتیبی کا شکار ہوتے ہیں۔ہر لمحہ اور ہر قدم پر ایک نئی الجھن کا سامنا ہوتا ہے۔ہر دل پر افسردگی چھائی ہوئی ہوتی ہے مگر افراد سب کچھ خاموشی کے ساتھ سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔کشورؔ کہتی ہیں:

حرفِ بشارت میرے شہر میں اُترا کب ہے
دل کے صحیفے ہیں بے نقط کتاب سنبھالے(۱۵)

شہروں کی جانب انتقالِ آبادی سے جنم لینے والے مسائل آج کے انسان کے دیرینہ مسائل ہیں۔بڑھتی ہوئی صارفیت نے مٹروپولس نظام کو تقویت بخشی ہے۔اس صورت حال سے نجات پانا مشکل تو ضرور ہے لیکن اگر بلا

ضرورت سہولیات کو ترک کیا جائے اور میکڈونلڈ پالیسی کو نظر انداز کر دیا جائے تو حالات میں تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے۔ کشورؔ ناہید نے مٹرو پولس صورت حال پر مفکرانہ نگاہ ڈال کر اس کے تمام گوشوں کو واضح انداز میں سامنے رکھ دیا ہے اور ساتھ ساتھ ہمیں دعوتِ فکر بھی دی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ،۲۰۱۵ء، ص ۱۳

۲۔ڈاکٹر اقبال آفاقی، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۸ء، ص ۲۷۰

۳۔ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت سوم، ۲۰۱۶، ص ۱۹۳

۴۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، کلیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۷۔ ایضاً، ص ۲۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۹۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۲۴